

# غیر مسلموں سے تعلقات

## اور ان کے حقوق

(ذریعہ طبع کتاب کا مقدمہ)

سید جلال الدین عمری

انسانی تعلقات کا مسئلہ سماج کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت اور نزاکت اس وقت ادبڑھ جاتی ہے جب کہ سماج میں مختلف افکار و نظریات اور عقائد و مذاہب کے ماننے والے ساتھ رہتے ہوں۔ ان کا طرز حیات اور ان کی تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے الگ ہو۔ اس صورت حال میں ظلم و زیادتی، حق تلفی اور نا انصافی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں فکری تعصبات، ذاتی اور قومی رجحانات اور سماجی عوامل رکاوٹ بننے لگتے ہیں۔ اس پر قابو پانا ہر مہذب اور صالح سماج کی اولین ضرورت ہے۔

انسانی تعلقات کا اخلاق اور قانون سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اخلاق کا ہدف ان تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانا ہے۔ قانون اس لیے ہے کہ انھیں جائز و دوس میں رکھے اور کسی کو ان سے انحراف اور تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اخلاق اور قانون اپنا فرض ادا کریں تو سماج کو امن و امان اور سکون کی دولت نصیب ہوگی، ورنہ جنگل کاراج ہوگا۔ حقوق پامال ہوں گے اور طاقت ور کے ظلم اور جبرہ دستی سے کمزور سکتے اور بدبلا تے رہیں گے۔

دنیا نے الفت و محبت کے پھول کھلتے بھی دیکھے ہیں اور قتل و خون اور قندہ و فساد کی کشت خزاں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ خدا کی اس زمین پر طبقات کا تصادم بھی رہا ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق بھی پایا گیا ہے۔ ظلم و زیادتی اور استحصال کی تیز و تند آندھیاں بھی چلی ہیں اور عدل و انصاف اور ایشارہ و ترجیح کے خوش گوار مناظر بھی دیکھنے کو

ملے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی روح تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ وہ انسان کو اخلاق اور قانون کا پابند بناتا ہے اس لیے انسانی تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانے اور عدل و انصاف کے قیام میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس کہ دنیا کے بیشتر مذاہب سے یہ روح جاتی رہی اور بے جان رسوم نے اس کی جگہ لے لی۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی۔ کہ زمانہ کی رفتار اور تغیر پذیر حالات میں زندگی کے پیچیدہ مسائل اور ان کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ ان کے غیر عقلی اور جامد رویے نے دنیا کو ان سے بے زار اور متنفذ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب سے رہنمائی کا مقام چھن گیا اور وہ انسان کی نجی زندگی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اجتماعی امور و معاملات اس سے آزاد قرار پائے۔ یہ رویہ پہلے مغرب نے اپنایا اور اس کے زیر اثر مشرق نے بھی عملاً اسے قبول کر لیا۔

اس وقت دوسرے مذاہب عالم زیر بحث نہیں ہیں۔ البتہ یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام کے بارے میں اس رویہ کو اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ لیکن مختلف اسباب و عوامل کے تحت دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے ساتھ زیادہ سخت رویہ اپنایا گیا۔ اسے اس طرح پیش کیا گیا جیسے وہ آج کے مہذب سماج کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس کا فروغ نوعِ انسانی کے لیے سخت تباہ کن ہے اور اس کی تاریخ نوعِ انسانی کے لیے ظلم و زیادتی کی تاریخ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام علمی رگی پسند ہے اور فرد کے اندر یہی رجحان پیدا کرتا ہے وہ دوسرے مذاہب کے ملنے اور مخالفت نقطہ نظر رکھنے والوں سے قطع تعلق کا حکم دیتا ہے اور مسلمانوں کو ان سب افراد سے کاٹ دیتا ہے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے۔ اسلام کی واضح تعلیمات اس کی ترویج کرتی ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط سے کبھی منع نہیں کرتا۔ ان سے سماجی، معاشرتی اور معاشی تعلقات کی اس نے اجازت دی ہے۔ البتہ وہ نہیں چاہتا کہ مسلمان کسی دوسرے گروہ میں ضم ہو جائیں۔ اس کے لیے اس نے کچھ حدود مقرر کر رکھے ہیں۔ ان حدود کی معقولیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ کسی

با اصول اور نظر یا قیامت کے لیے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔  
 اسلامی ریاست کے بارے میں تصور یہ ہے کہ اس میں سارے حقوق مسلمانوں  
 کو حاصل ہوں گے اور غیر مسلم بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہوں گے۔ وہ  
 جنگی غنائم کے ساتھ کام کرے گی۔ حالانکہ اسلامی ریاست کا مقصد قرآن کے الفاظ  
 میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر (الحج: ۱) اور عدل و انصاف کا قیام ہے (الحمد: ۲۵)  
 وہ ہر انسان کے جائز اور فطری حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

ان خیالات کے پیچھے ناواقفیت اور لاعلمی کے ساتھ بہت سے تاریخی عوامل  
 کار فرما ہیں۔ ان میں اسلام کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کی نفسیات۔ اسلام کی سر بلندی اور  
 فرماں روائی کا خوف اور اسے کسی قیمت پر گوارا نہ کرنے کا جذبہ اور مسلمانوں کے ساتھ تہیب  
 اور عداوت بھی شامل ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کی صاف اور واضح تعلیمات کو سمجھنے کی  
 کوشش تو نہیں ہوتی البتہ انھیں منہ مٹانے اور اسلام کو بھیانک شکل میں پیش کرنے کی تدبیریں  
 ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پورے رویہ میں مسلمانوں کی کوتاہی کا بھی بڑا  
 دخل ہے۔ انھوں نے مختلف مسائل میں غیر مسلموں کے سامنے سنجیدہ اور علمی انداز میں اسلام  
 کا موقف واضح کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی جیسے ہونی چاہیے۔ مسلمانوں  
 اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کی کمی بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ دونوں میں  
 صدیوں سے ایک طرح کی دوری اور حجاب رہا ہے۔ ایک دوسرے کے موقف  
 کو سمجھنے کے لیے جس ٹھنڈے ماحول کی ضرورت ہے وہ نہیں فراہم ہوا۔ اس لیے  
 بدگمانیاں پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی رہیں۔

اس پورے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۱۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ دنیا کے مذاہب میں کس کا رول شخصی اور انفرادی  
 زندگی تک محدود ہے اور کس کے دائرے میں اجتماعی مسائل بھی آتے ہیں۔ البتہ اسلام  
 کی حد تک یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ ایک جامع اور مکمل دین اور عقیدہ و عمل کا  
 ایک مربوط نظام ہے۔ اس نے اس وسیع کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے  
 مطابق صرف مضبوط عقیدہ ہی نہیں دیا بلکہ اس کی بنیاد پر انسان کی زندگی کو ایک

خاص رخ عطا کیا ہے عبادت کے ذریعے خدا سے انسان کا تعلق جوڑنا اور اسے انتظام بخشنا ہے اور اخلاق اور قانون میں اس کے احکام کا اسے پابند بنانا ہے۔ خاندان، معاشرہ، ریاست، شخصی، ملی اور بین الاقوامی تعلقات سب اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ اس کے اس موقف سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطالبہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ انفرادی زندگی تک اپنے آپ کو سمیٹ لے۔ وہ محدود مذہبیت کا مخالف ہے جس میں خدا اور قیصر کے حقوق الگ الگ ہوں

۲۔ اسلام ایک عالمی دین ہے وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا خطاب سب انسانوں سے اور ان کے سبھی طبقات سے ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولٌ  
اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ  
مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ... (الاعراف: ۱۵۷)

دے پیغمبر، کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم  
سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ  
اللہ جس کا آسمانوں اور زمین پر اقتدار ہے۔

جس دین کا خطاب دنیا کے تمام انسانوں اور ان کے تمام طبقات سے ہو، جو اس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ سارے عالم کی فلاح و نجات کا ذریعہ ہے۔ وہ کسی طبقہ سے نفرت اور عداوت کا سبق نہیں دے سکتا، ورنہ اس کا خطاب محدود ہو کر رہ جائے گا۔ جو نظریات طبقات کے درمیان کشمکش پیدا کرتے ہیں وہ ایک کے ذریعے دوسرے کا استحصال کرتے ہیں۔ ان میں عمومی اپیل نہیں ہوتی۔ وہ ایک کے لیے پرکشش ہوتے ہیں تو دوسرے کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے۔

۳۔ اسلام نے اپنے عقیدے اور فکر کو عام کرنے کے لیے جبر و اکراہ کے تمام طریقوں کو رد کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ اس کے نزدیک ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کے لیے اس نے صرف دعوت و تبلیغ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ وہ اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے قبول یا رد کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس نے صبر و ثبات کے ساتھ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور مخالفت اور فراموشی کو غم و حوصلہ اور بہت سے برداشت کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يُلْقُونَكَ وَاهْجُرْهُمْ

جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور

ہَجْرًا جَمِيلًا - (الزلزلہ : ۱۰) ان کو اچھی طرح چھوڑ دو۔

اس نے بار بار کہا ہے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (الزخرف : ۱۹)  
ان سے درگزر کیجئے اور سلام کہئے

ایک جگہ ارشاد ہے :

فَاصْفَحْ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَقُ الْعَلِيمُ  
ان سے اچھی طرح درگزر کیجئے تمہارا رب وہی ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور

یاخبر بھی ہے۔ (الحجر : ۸۵-۸۶)

اس نے اپنے ماننے والوں کی یہ خوبی بیان کی ہے۔

وَأَنْكَرَ لِمَیْمِنٍ أَنْعَیْظَ وَالْعَافِیْنَ  
وَعَنِ النَّاسِ (آل عمران : ۱۳۲)  
وہ غصہ کے پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔

اس نے ہدایت کی ہے کہ بات چیت میں، دعوت میں اور اپنے طرز عمل میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے بدترین دشمن کی دشمنی ختم ہو جائے اور وہ دوستوں کی صف میں آجائے۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ  
فَإِنَّ الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ  
كَأَنَّهُ وَبِئْسَ حَمِيمٌ هـ وَمَا يُلْقَاهَا  
إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَاهَا  
إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ  
دفاع کرو (جواب دو) اس طریقہ سے جو بہتر ہو۔ اس سے تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ جگڑی دوست ہو جائے گا۔ یہ خوبی صبر کرنے والوں ہی کو ملتی ہے۔ یہ ان ہی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں۔

(حم السیہ : ۳۲-۳۵)

کیا ان واضح تعلیمات کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اپنے مخالفوں کو برداشت نہیں کرتا اور ان سے جنگ کی زبان میں بات کرتا اور اپنا عقیدہ ان پر جبر مسلط کرتا ہے۔

۴۔ اسلام سچے دل سے خدا اور رسول کو ماننے اور خوش دلی سے ان کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ چیز جبر واکراہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ جہاں جبر واکراہ ہوگا وہاں ایمان اور اسلام کا اظہار تو ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایمان نہیں بلکہ نفاق ہوگا۔ قرآن مجید نے

نفاق کو دل کا روگ، جھوٹ اور خدا اور رسول کے ساتھ دھوکہ اور فریب کہتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ  
 اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاٰلِیَوْمِ الْاٰخِرِ  
 وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۗ یُخَادِعُوْنَ  
 اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ، وَمَا  
 یُحْصِیْهِمْ اِلَّا اللّٰهُ ۗ وَمَا  
 لَیْسَ عَلَیْهِمْ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ  
 فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَاَلَمْ یَكُنْ  
 عَذَابُ الْیَمِّۤ اَلِیْمًاۙ لِّمَنۢ  
 یَّكْذِبُوْنَ ۗ

ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا اس  
 جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بول رہے تھے۔

(البقرہ: ۸-۱۰)

اس نے کہا کہ منافقین کا وہی انجام ہوگا جو انجام کہ خدا کے منکرین کا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ  
 وَاَلْكَٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا (النساء: ۱۴۰)

کافروں کو جہنم میں ایک جابجہ کر دینگا۔  
 ایک اور جگہ ان کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرَجٰتِ الْاَسْفَلِ  
 مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵)

بے شک منافقین جہنم کے سب  
 سے نیچے درجے میں ہوں گے۔

قرآن مجید نے منافقین پر جتنی سخت تنقید کی ہے اور ان کی ذمہ داری، خود غرضی، بے عملی بلکہ بدعملی کو نمایاں کیا ہے اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے، کیا اس کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی صفوں میں منافقین کا اضافہ ہوتا چلا جائے؟ کیا وہ ایسا طریقہ اختیار کرے گا کہ سماج میں نفاق کی آبیاری ہو اور وہ فروغ پاتا چلا جائے؟ اسلام اگر جبر واکراہ کے موقف میں ہو تو بھی کسی کو ایمان اور اسلام پر مجبور نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس سے نفاق کی راہ کھلتی ہے۔ دنیا

کا کوئی عقیدہ اور کوئی فکر و نفاق کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا اسلام ہی اس کے ابھرنے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرے گا؟

اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ یہ سوال ابھر آتا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کی کیا حیثیت ہوگی؟ ان کے حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا؟ اس ذیل میں بھی بعض باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱۔ اسلامی ریاست انسانی حکمرانی کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں اقتدار کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ کوئی فرد یا گروہ یا مجموعہ افراد نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ریاست اپنا نظم چلاتی ہے۔ اس میں حالات و ظروف کے لحاظ سے نئے قوانین بھی وضع ہوں گے اور نئی راہیں بھی تلاش کی جائیں گی، لیکن یہ سب کچھ کتاب و سنت کے حدود کے اندر ہوگا۔ اس سے باہر نکلنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔

۲۔ اسلامی ریاست کی باگ ڈور فطری طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے مملکت کی اساس تسلیم کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اس پر ایمان نہیں ہے ان پر نہ تو اس کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے اور نہ وہ اسے خوش دلی سے چلا سکتے ہیں۔ لیکن ریاست میں انہیں خدا اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہوگی۔ اسلامی قانون کی رو سے ان کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی فرد یا جماعت کو ان حقوق پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔ انتظامی امور میں حکومت ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور ان سے تعلقات کا یہ قانونی پہلو ہے۔ لیکن عام زندگی میں قانون سے زیادہ اخلاقی رویہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلام نے تعلقات میں صداقت اور راست بازی کی پابندی اور جھوٹ اور مکرو فریب سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ نخوت اور استکبار کی جگہ تواضع اور خاکساری کا مزاج پیدا کیا ہے۔ درشت مزاجی اور شدت کے مقابلے میں نرمی اور رافت کو پسند کیا ہے۔ عینظ و غضب پر قابو پانے اور تحمل و برداشت کا رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انتقام میں حد سے آگے نہ بڑھنے اور عفو و درگزر سے کام لینے اور برائی کا

بدلہ بھلائی سے دینے کی ترغیب دی ہے۔ شر اور فتنہ و فساد سے بچنے اور ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی ہے۔ اس معاملے میں اس نے اپنوں اور غیروں میں فرق نہ کرنے کا درس دیا ہے۔ یہ ہدایات بالکل عام ہیں۔ صرف مسلمانوں سے باہم تعلقات ہی میں نہیں بلکہ ایک مسلمان کا ربط و تعلق کسی بھی مذہب و عقیدہ کے ماننے والے کسی بھی فرد سے ہو، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کا پابند رہے گا۔ جس سماج میں ان اخلاقیات کی قرآن روائی ہو وہاں فطری طور پر ظلم و زیادتی کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے اور اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی غلط قدم اٹھے تو قانون اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگا اور اپنا فرض انجام دے گا۔

۴۔ اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ جہاد کا ذکر اس طرح چھڑ جاتا ہے جیسے اس کا مقصد وجود یا اولین ہدف مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف صف آرا کرنا اور جہاد کے نام پر قتل و خون ریزی کا بازار گرم کرنا ہے۔ حالانکہ جس طرح دنیا کی ہر ریاست کو جنگ سے سابقہ پیش آسکتا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کو بھی جہاد کرنا پڑ سکتا ہے۔ اسے اس کے حقیقی پس منظر میں اور اپنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ وہ ایسی جنگ نہیں ہے جو قتل و خون ریزی اور انسانوں کو محکوم بنانے اور حکم رانی کی خواہش کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے بلکہ اس جنگ کے پیچھے اعلیٰ اخلاق، عدل و انصاف پر مبنی قانون، دعوت و تبلیغ کا مخلصانہ جذبہ اور انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کی تمنا اور آرزو موج زن ہوگی۔ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے کتنی مختلف ہوگی اور اس کے کتنے اچھے ثمرات سامنے آئیں گے۔

آئندہ اوراق میں غیر مسلموں سے تعلقات کی بحث بھی ہے اور ان کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ تعلقات میں خاندانی، سماجی، معاشرتی، معاشی کئی طرح کے تعلقات زیر بحث آئے ہیں۔ بعض اہم قانونی مسائل میں شریعت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ان تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ تعلقات اور حقوق فرد اور ریاست دونوں ہی سے متعلق ہیں البتہ تعلقات میں شخصی پہلو غالب ہے۔ حقوق کا رشتہ ریاست سے جڑ جاتا ہے۔ ریاست کی بحث میں غیر مسلم کی حیثیت اور اس کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ اس ذیل میں جہاد اور اس کے احکام پر تفصیل



سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری صفحات میں غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام و ہدایات کا پس منظر بیان ہوا ہے۔

کتاب میں اصلاً قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کی شرح و تفسیر میں معتمد علماء اور شارحین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض فقہی مسائل میں فقہاء کے خیالات تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں صرف وہ رائے بیان کی جانی چاہیے جسے لکھنے والا صحیح سمجھتا ہو اور جسے اس کے نزدیک ترجیح حاصل ہو، اس لیے کہ تفصیلات سے ذہن الجھن محسوس کرتا ہے۔

یہ ممکن تھا اور آسان بھی۔ لیکن جن حضرات کی فقہی ذخیرہ پر نظر ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے سامنے دوسری رائیں بھی ہوتیں۔ اس انداز بحث پر یہ الزام بھی عائد ہو سکتا تھا کہ ذاتی رجحان کے تحت مخالف رایوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ مختلف رایوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی کسی رائے کو ترجیح دی جائے۔ پھر یہ کہ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے۔ دنیا کے ہر موضوع کا جس میں فقہ بھی شامل ہے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید علمی تصنیفات اور انسائیکلو پیڈیاز میں ہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ بعض فقہاء کے خیالات سے غیر مسلم قارئین تو خوش محسوس کریں گے اس لیے ان کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی بہت زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطالعہ مذاہب اب عام ہو رہا ہے۔ ہمارے دینی اور فقہی لٹریچر سے مسلمان علماء ہی نہیں، غیر مسلم اصحاب علم بھی واقف ہیں۔ وہ فقہی اختلافات کے درمیان صحیح نقطہ نظر جانتا چاہیں گے۔ اس لیے ان کے نقطہ نظر سے بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ زیر بحث مسائل میں فقہی آراء کا تجزیہ کر کے بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں بہتر اور موزوں رائے کیا ہے، اور اسے کس بنیاد پر ترجیح حاصل ہے، اس کو شش میں کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی گئی ہے جو بے دلیل ہو اور جسے سلف کی بالکل تائید حاصل

نہ ہو۔

فقہاء کی رایوں میں سختی بھی ہے اور نرمی بھی۔ تنگی بھی ہے اور توسع اور کشادگی بھی۔

جن مسائل میں فقہاء کی رائیں سخت اور بے لچک معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے غیر مسلموں سے ملکی خدمات لینے یا مختلف معاملات میں ان پر اعتماد کا مسئلہ۔ انھیں اس وقت کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے ورنہ انھیں ہدف تنقید بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کے دور اول یا اس کی ابتدائی صدیوں میں جو ممالک فتح ہوئے یا جہاں تبلیغ و دعوت کامیاب رہی وہاں کی اکثریت دین کی آغوش میں آتی چلی گئی۔ اس میں حجاز، مصر، عراق، شام اور افریقہ و ایشیا کے بعض ممالک شامل ہیں یہاں غیر مسلم تھے بھی تو چھوٹی سی اقلیت میں تھے۔ ان ممالک میں اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومتی اداروں میں غیر مسلموں کی شرکت نمایاں نہیں ہے اور فقہاء کے ہاں اس طرح کی رائیں بھی ملتی ہیں کہ ملکی نظام، اس کے دفاع اور حفاظت کے لیے ان کی خدمات کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی مملکت ہے جس میں مسلمان اپنے تمام داخلی و خارجی امور میں خود کفیل ہیں اور انھیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہے۔ یہ صورت حال ان ممالک کی نہیں ہو سکتی جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اقلیت میں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں۔ یہاں امور مملکت میں انھیں شریک کیے بغیر اس کا چلانا ممکن نہ ہوگا۔ اس صورت میں بظاہر فقہی رائے بھی مختلف ہوگی۔

موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج وجود میں آ رہے ہیں اور کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ اقلیتیں انتظام ملکی میں شریک رہیں۔ انھیں الگ تھلگ نہ رکھا جائے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

معاملات میں غیر مسلموں پر اعتماد اور عدم اعتماد کی بحث میں خیال ہوتا ہے کہ اس وقت کی پوری دنیا کی صورت حال کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اسلامی دور کی ابتدائی صدیوں میں مسلمان فی الجملہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے برتر تھے، ان کے اندر خدا کا خوف تھا، اخلاق بلند تھی، معاملات کے صاف اور کھرے تھے، ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے ارد گرد کی دنیا میں اخلاقی گراؤ اور پستی تھی، افراد اور اقوام اپنا اعتماد دکھو چکی تھیں، راست بازی، دیانت و امانت اور ایفاء عہد جیسی خوبیاں کم زور ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں یہ سوال بہر حال

پیدا ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے معاملات میں دوسروں پر کس حد تک اعتماد کر سکتے ہیں، بعض حضرات نے اسے انفرادی نقطہ نظر سے دیکھا کہ افراد صحیح اور غلط ہر طرح کے ہوتے ہیں، ان کے متعلق کوئی عمومی فیصلہ صحیح نہ ہوگا۔ بعض حضرات نے اسے برجستگی قوم دیکھا اور عمومی رائے قائم کی۔

اب صورت حال بدل گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی کی کیفیت ختم ہو چکی ہے، ان کا اخلاقی امتیاز باقی نہیں رہا، بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کا معیار دوسروں سے فروتر ہے۔ معاملات میں دوسرے زیادہ بھروسہ کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر مسلمانوں سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال بعض قدیم رایوں پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے۔

غیر مسلموں اور ان کے حقوق کے ذیل میں دارالاسلام، دارالرحب اور دارالامان جیسی بخشیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوئی ہیں، بلکہ قبہ اکرام نے اسلامی نقطہ نظر سے مختلف ممالک کی حیثیت واضح کرنے کے لیے وضع کی ہیں۔ ان کے نزدیک دارالاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان امن و امان کی زندگی گزار رہے ہوں۔ اور مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہ لاحق ہو۔ دارالرحب وہ ہے جہاں کفر و شرک کا غلبہ اور احکام کفر و شرک جاری ہوں۔ دارالاسلام اور دارالرحب کے درمیان امن کا معاہدہ ہو تو وہ دارالامن ہوگا۔ ان سب کے احکام مختلف ہیں۔ اس وقت دنیا کا کوئی ملک دارالاسلام ہونے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح اس نے کسی ملک کو دارالرحب قرار دے کر اس سے اعلان جنگ نہیں کر رکھا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک بین الاقوامی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ حالات اس موضوع پر از سر نو غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مسلم ممالک کی از روئے شرع ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کریں۔ انھیں اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل کی آزادی ہو۔ انھیں ترقی کے مواقع فراہم ہوں اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی از روئے دستور متروع ہو۔

غیر جمہوری ممالک میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں وہ بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ لیکن جمہوری ممالک میں بڑی حد تک بنیادی حقوق انھیں حاصل ہیں۔ انھیں

جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ملا ہوا ہے۔ عقیدہ اور عبادت کی آزادی میسر ہے۔ وہ آزادی سے نماز اور روزے پر عمل کر سکتے ہیں، زکوٰۃ کا اپنا نظم چلا سکتے ہیں، حج کی انہیں اجازت ہے۔ مساجد کی تعمیر اور ان کی آباد کاری کا نظم کر سکتے ہیں۔ جمعہ اور عیدین کے قیام کی انہیں اجازت ہے۔ عائلی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، وقف اور ہب وغیرہ جیسے معاملات میں اسلامی قانون ان پر نافذ ہوتا ہے۔ وہ دینی اور دنیوی تعلیم کا نظم کرنے اور دینی مدارس اور دنیوی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں از روئے دستور انہیں مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی بات یہ کہ جمہوری ممالک میں انہیں اپنے دین کی تبلیغ کی اجازت حاصل ہے۔ وہ اسے عام کر سکتے ہیں جس ملک کے یہ حالات ہوں اسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ دین پر عمل کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے جو مواقع انہیں حاصل ہیں ان سے انہیں فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال دارالحرب یا دارالاسلام کی نہیں ہے۔ غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت وہ نہیں ہوگی جو جریہوں کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ وہ ملک کے پرامن شہری ہوں گے۔

کتاب میں یہ تمام پہلو پیش نظر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اوراق اس کے دین کو سمجھنے کا ذریعہ ثابت ہوں، اس کے بندوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے اسے شرف قبولیت بخشے۔

## تحقیقات اسلامی کے سولہ سال

انشاریہ ۱۹۸۲-۱۹۹۷ء

مجلد ہای تحقیقات اسلامی کو جاری ہونے سولہ سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں مختلف دینی اور علمی موضوعات پر اس میں کون کون سے مضامین شائع ہوئے ہیں؟ اور کن اصحاب علم کا اسے تعاون حاصل رہا ہے؟ مضامین اور مصنفین کا مکمل انشاریہ۔ تحقیق کام کرنے والوں اور علمی و دینی مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کی

ایک اہم ضرورت۔ صفحات: ۶۴ قیمت: ۱۰ روپے

مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ